بھی شریک نہ ہوا ہو"۔ سو مشرکین جو تم سے معاہدہ کر چکے ہیں اور جنہوں نے کسی طرح اس کی خلاف ورزی اور تمہارے مقابلہ میں کسی کی حمایت نہیں کی ہے۔ تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ ایفائے عہد کرو۔ جب کبھی آنحضرتؐ اپنی فوجوں کو روانہ فرماتے، تو آپ خاص طور پر اس امر کی تاکید فرماتے کہ کسی کو دھوکا نہ دیا جائے اور نہ کوئی عہد توڑا جائے۔ جنگ کو دھوکا اور فریب دہی کی ایک بازی سمجھا جاتا ہے اور یہ چیز زبان زد عام ہو چکی ہے کہ محبت کی طرح جنگ میں بھی ہر چیز جائز ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاقیت کے بنیادی اصول کی بھی بیباکانہ خلاف ورزی کی جا سکتی ہے۔ میدان جنگ میں دشمن کو اپنی طاقت اور تعداد کی بابت دھوکا دینا ضروریات جنگ سے ہے، لیکن اس کے علاوہ اسلام اپنے پیروؤں کو حکم دیتا ہے کہ وہ انسانیت کے بنیادی اوصاف کی اپنے معاندین کے ساتھ بھی پابندی کریں۔ خیانت اور عہد شکنی کی کسی حالت میں بھی اجازت نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا، جبکہ ایک تنہا مسلمان نے، اگرچہ وہ اس کا مجاز نہیں تھا، دشمن کی محصور فوج سے اس شرط پر کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دیں، یہ وعدہ کیا کہ ان کی جان و مال سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ جب مسلمان فوجوں نے ان پر دست درازی کرنی چاہی تو انہوں نے اس منفرد مسلمان کا وعدہ پیش کیا۔ خلیفہ نے اس عہد کی توثیق کی اور یہ کہا کہ اگرچہ وہ ایسے معاہدہ کا مجاز نہیں تھا لیکن پھر بھی اس کا معاہدہ صاحب اختیار کی طرح سمجھا جائے گا۔ یہ ایسا ہی ہو گا جیسا کہ پوری جماعت نے اس کی منظوری دی ہے۔ یہی قانون جو معاہدوں کو جنگ میں برقرار رکھنے کا حکم دیتا ہے، اس کا اطلاق مسلم رعایا اور غیر مسلم حکومتوں کے باہمی تعلقات پر بھی ہو سکتا ہے۔ ہدایہ جو مسلمانوں کے قانون اور فقہ کی مشہور کتاب ہے صراحتاً بیان کرتی ہے کہ جب کبھی کوئی مسلمان کسی غیر مسلم مملکت میں داخل ہوتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے باشندوں کی جان و مال کا احترام کرے، کیونکہ اس نے بن کہے اس امر کا عہد کیا ہے کہ وہ ایسا ہی کرے گا"۔

ہم نے اسلامی مملکت کے بنیادی اصول سے مختصراً بحث کی ہے اور کچھ معاشی فلاح و بہبود کے اصول اور کچھ صلح و جنگ کے لوازم بحیثیت اساسی اصول کے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ اس کے لوازم ہیں جنہیں مسلمان شریعت اور اسلامی قانون سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ وضع قانون محض دستور کا بنیادی اصول ہونے سے کہیں زیادہ وسیع چیز ہے۔ یہ معاملہ نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ قانون سازی کی بابت اسلام کے رجحان کو سمجھا جائے۔ قانون زمانہ اور حالات کے موافق ہونا چاہیئے اور اس میں قوم بہ قوم اور عہد بہ عہد تنوع اور اختلاف ضروری ہے۔ یہاں ہم ایک اجتہاد جیسے متنازع فیہ مقام پر پہنچتے ہیں کہ تمام ترقی پذیر اقوام کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے قوانین کو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ مطابقت دیں۔ کیا اسلام کوئی ایسا ناقابل تغیر ضابطہ پیش کرتا ہے جو اہل میڈیا اور پرس کے مشہور آفاق قوانین کی طرح ہے؟

اسلامی سلطنتوں کے جمود کے بعد سے کچھ اس قسم کے خیالات تقلید پرست علماء اور ناواقف عوام نے اختیار کرنا شروع کئے۔ مغرب کے نکتہ چین یہ کہنے لگے کہ مسلمانوں کے قانون کی سخت گیری نے حالات کے ساتھ ترقی پذیر مطابقت میں ایک عظیم رکاوٹ

ہے۔ اس نکتہ چینی میں بہت کچھ صداقت پنہاں ہے۔ مگر یہ الزام اسلام کے سر نہیں منڈھا جا سکتا۔ جب اسلام ایک زندہ قوت تھا اور اپنے اقتضاء کے مطابق ایک کامل تہذیب کی تشکیل کر چکا تھا تو اعاظم فقہا کے ذریعہ آزادانہ قانون سازی کی جاتی تھی اور مسلمان مملکتیں اپنی معاشی اور معاشرتی زندگی کو تغیر پذیر حالات کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیتی تھیں۔ اسلام ابتداءً کوئی وسیع اور جامع ضابطۂ قوانین اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ اس نے ایک مہذب زندگی کے لئے صرف اساسی اصول عطا کئے تھے جو افراد اور معاشرہ کے لئے کامل خوشحالی کے کفیل تھے۔ اسناد میں مستند ترین کتاب قرآن ہے لیکن اس پوری کتاب مقدس میں ضابطۂ قوانین دس صفحات سے زیادہ پر پھیلے ہوئے نہ ہوں گے۔ اس طرح پر اسلام کسی ایسے بوجھل مجموعہ قوانین سے گرانبار نہیں ہے، جو اپنی غیر تغیر پذیری کے سبب ترقی پذیر قانون سازی کی راہ میں حائل ہو۔ قرآن جیسی ایک مختصر سی کتاب صرف زندگی کے بنیادی اصول ہی پیش کر سکتی ہے۔ بجز خدا کی یگانگت پر ایمان لانے اور انسان کو تمام خداؤں اور اصنام کی پرستش کو ترک کر کے ایک ایسے خالق موجودات کی عبادت پر مائل رہنے کی نصیحت کے، جو تمام اقدار کا خالق و محافظ ہے اور اور جس کی عبادت ذہنی تمثالوں میں نہیں بلکہ خالص جذبہ کے ساتھ کرنی چاہیئے۔ اور بجز معاشرتی عدل پر عمل اور شخصی اخلاص و پاکیزگی کی نصیحت کے قرآن میں بہت کم ایسی چیزیں ہیں جنہیں غیر تغیر پذیر ابدی قوانین کی طرح پیش کیا گیا ہو۔ یہ کتاب زیادہ تر اساسی اصول پر مشتمل ہے جن میں بعض ایسے ہیں جو حسب حالات مطابق کئے جا سکتے ہیں۔ یہ اصول ہی ہیں جو ابدی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ ان کی زمانی تطبیق۔ خود آنحضرتؐ اور آپ کے خلفاءؓ نے ان بنیادی اصولوں کو مختلف طریقوں سے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ان کے مناسب حال تطبیق دی۔ مگر یہ سب کچھ لوازم اسلام کے اندر رہ کر کیا گیا تھا کیونکہ یہ پوری طرح اسلام کی روح کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھے۔ فقہا نے متاخرین کو علم فقہ کی تفصیلات کی تکمیل کرنی پڑی اور انہیں ایسے جامع ضوابط مدون کر لینے پڑے جو حقیقی اور فرضی صورتوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ بعد میں یہ فقہی مذاہب اسلامی تقلید پرستی کے پشت پناہ بن گئے اور یہ لوازم بھی اسلام کی طرح قائم اور اٹل سمجھے جانے لگے۔ اس طرح کی فرسودہ تقلید پرستی مسلمان مملکتوں کے سیاسی جمود کا نتیجہ تھی اور ان کی تخلیقی ذہانت متصوفانہ تحریک اور آزادانہ تحقیق غیر اسلامی جابرانہ حکومتوں اور شاہی خاندانوں کی باہمی کشمکش کے ذریعہ دبادی گئی تھی۔

(مترجم قطب الدین)

حکمت رومی

مصنفہ خلیفہ عبدالحکیم

قیمت تین روپے

افکار ابن خلدون

مصنفہ مولانا محمد حنیف ندوی

قیمت ساڑھے تین روپے

ملنے کا پتہ :- ادارہ ثقافت اسلامیہ ۔ ۲ کلب روڈ ۔ لاہور

محمد مظہر الدین صدیقی

اسلامی تہذیب کا ارتقاء

مغرب کے اس قدیم نظریہ میں کوئی حقیقت نہیں ہے کہ اسلام بادیہ نشینوں کا مذہب اور صحرائی ماحول کی پیداوار ہے غالباً سب سے پہلے رینان نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ توحید صحرا کا قدرتی مذہب ہے۔ اس وقت سے بعض حلقوں میں یہ دلیل نہایت معقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی وحدت اور ماورائی عظمت کا جو تصور پیش کیا وہ ایک بے آب و رنگ اور ناپیداکنار ریگستان کا ذہنی عکس ہے۔ جدید ترین تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ یہ سب تصورات خیالی ہیں۔ نہ تو اسلام کی ابتداء میں اور نہ اس کے ارتقاء میں صحرائی ماحول کا کوئی دخل تھا۔ اسلام میں عربیت کا جو رنگ پایا جاتا ہے اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اس مذہب کا آغاز عرب میں ہوا یا یہ کہ اس کے ابتدائی پیرو عرب تھے بلکہ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید جو اسلامی عقائد اور تعلیمات کا مبداء ہے عربی زبان میں نازل ہوا اور اسلامی ذہن کی تشکیل میں سب سے زیادہ اہم حصہ اسی کتاب کا ہے۔

اگرچہ اسلام کی ابتداء مکہ میں ہوئی جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تبلیغ کا آغاز فرمایا۔ لیکن ایک دینی نظام کی حیثیت سے اس کی خصوصیات کا نشوونما مدینہ میں ہوا اور آپ کی وفات سے پہلے ہی یہ امر ظاہر ہو گیا کہ اسلام صرف چند شخصی عقائد کا نام نہیں بلکہ ایک جامع دین ہے۔ جس میں ایک اُمت ۔ حکومت اور ضابطہ حیات کا تصور مضمر ہے۔

اسلام نے مدینہ میں نہ صرف ایک مضبوط حکومت قائم کی بلکہ اپنے پیرووں میں ایمان و عمل کی ایسی گرمجوشی پیدا کر دی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں جزیرہ نمائے عرب کا سارا مغربی حصہ اس کے زیر نگین ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب شمالی اور مشرقی عرب سے پھیل کر بازنطینی سلطنت کے صوبہ شام اور ایرانی سلطنت کے صوبہ عراق تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد ہی مصر پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور ایک صدی کے اندر اندر مغرب میں مراکش اور اندلس بلکہ فرانس کی سرحد تک اور مشرق میں سندھ اور وسط ایشیا تک اسلامی پرچم لہرانے لگا۔ ان فتوحات سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اسلام ایک کامیاب دین کی خصوصیات کا حامل ہے۔ اور ہر اس چیز کو مخاصمانہ نظر سے دیکھتا ہے جو اس کے حلقۂ اطاعت اور دائرۂ اقتدار سے خارج ہو۔ لیکن ان فتوحات نے یہ بھی ثابت کیا کہ اسلام اپنے پیرووں میں مسلک اور عقیدہ کے اختلافات اور مذہبی تنوع کو خوشی سے برداشت کر سکتا ہے اور دوسرے مذاہب اور ادیان کے ساتھ رواداری اور کشادہ دلی کا سلوک کر سکتا ہے۔

اسلامی فتوحات کا حیرتناک پہلو صرف یہ نہ تھا کہ اس کی رفتار نہایت غیر معمولی تھی ، اس سے زیادہ تعجب خیز امر یہ تھا

کہ ان فتوحات کے دوران میں کوئی بدنظمی نہیں پیدا ہوئی بلکہ یہ نہایت باقاعدہ اور پُرامن تھیں اور ان کے باعث جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں، ان سے زندگی اور تمدن کے کسی گوشہ میں برہمی نہیں پیدا ہوئی۔ دوران جنگ میں کچھ نہ کچھ تباہی ضرور عمل میں آئی ہوگی لیکن یہ اتنی معمولی تھی کہ زمانہ مابعد میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اس کے برعکس عربوں کی فتوحات کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس علاقہ کی کئی تہذیبوں اور قوموں کو باہم اختلاط کا موقع ملا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت اور قانون کا جو نظام تعمیر کیا تھا۔ اس کی بدولت عربی افواج تخریبی عناصر اور وحشیانہ افعال سے محفوظ رہیں۔ اسلام مفتوحہ علاقوں میں ایک فاتحانہ طاقت کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اخلاقی قوت کے روپ میں نمودار ہوا جس کا لوگ احترام کرنے پر مجبور تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک متوافق الخیال نظام عقائد بھی تھا جو ایران کے زردشتی مذہب اور بازنطین کی مشرقی عیسائیت کا کامیاب حریف تھا۔ یہ صحیح ہے کہ عربوں کی غارتگرانہ جبلتیں کبھی کبھی خانہ جنگیوں میں ابھر آتی تھیں لیکن بالآخر اسلامی وحدت کا احساس انہیں مغلوب کرنے میں کامیاب رہا۔

جہاں تک مفتوحہ ممالک کے باشندوں کا تعلق تھا عربوں کی حکومت سے ان کی سیاسی حیثیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا کیونکہ ان کیلئے یہ صرف آقاؤں کی تبدیلی کا مسئلہ تھا۔ انکی زندگی اور تمدنی اداروں کا تسلسل اسی طرح قائم رہا۔ ان کو نہ معاشی حیثیت سے کسی قسم کے ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑا اور نہ مذہبی حیثیت سے ان پر عقائد کے بارے میں کوئی جبر کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ اور نہایت غیر محسوس طریقہ سے اسلام نے ابھر اور مغربی ایشیا کے تمدنی نظام کو تبدیل کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایرانی اور بازنطینی تمدن میں اسلامی عناصر کے داخلہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ مفتوحہ علاقوں میں عربوں کی جو فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئی تھیں ان کی ایک تہذیبی اہمیت بھی تھی، کیونکہ یہی مقامات اسلامی تبلیغ کے مراکز بھی تھے۔ مفتوحہ ممالک کی دولت سے استفادہ کرنے کے علاوہ ان فوجی چھاؤنیوں کو تبدیل مذہب کے باعث ایک نئی انسانی دولت بھی ہاتھ آئی اور اس طرح یہ نئے شہر اسلامی تہذیب و تمدن کے ملجا و مرجع بن گئے۔

سن ۶۶۱ھ میں عربوں کی حکومت کا پایۂ تخت دمشق میں منتقل ہو گیا۔ جو کہ بنی امیہ کا مرکز اقتدار تھا۔ اگرچہ مدینہ اب بھی مسلمان عربوں کا دینی مرکز اور اسلامی علوم کا گہوارہ تھا لیکن عربوں کی حکومت اور ان کے سیاسی اور سماجی ادارے بازنطین کے تہذیبی اثرات کے حلقہ میں آ گئے تھے۔ اسلامی تہذیب اور بازنطینی تہذیب کے باہمی ردعمل کا پہلا نمونہ بعض اموی عمارتوں میں نظر آتا ہے۔ اس ردعمل کی ذہنی علامت وہ نئے مذہبی فرقے ہیں جو اس زمانہ میں نمودار ہوئے، اور جن پر یونانی فکر کے نقوش ثبت ہیں۔ بہرحال اس کا آخری نتیجہ دین اور حکومت کے افتراق میں ظاہر ہوا جس کی وجہ سے بنو امیہ کے اقتدار کو بڑا زبردست دھکا لگا۔ پھر جب عجمی مسلمانوں کی برہمی نے اس افتراق کو اور زیادہ ہوا دی اور عربوں کے قبائل میں باہمی خانہ جنگی شروع ہو گئی تو اس کے لازمی نتیجہ میں اموی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور اس کی جگہ عباسی خاندان برسر اقتدار آ گیا۔

لیکن اس عرصہ میں اسلام کو صرف سیاسی اور ملکی حیثیت سے ہی توسیع و ترقی نصیب نہیں ہوئی بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو وہ فکری اور علمی نقطۂ نظر سے بھی ترقی اور توسیع کے دور سے گزر رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست شخصیت نے

مسلمانوں کے عقل و دماغ پر جو گہرے اثرات چھوڑے تھے ان کا اعلیٰ ترین اور قوی ترین مظاہرہ تہذیب اور علم کے میدان میں ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ محض ان معنوں میں خالی مذہبی مصلح نہ تھے بلکہ تہذیب و تمدن اور علم و فکر کے ارتقاء میں بھی آپ کی شخصیت ایک نہایت زبردست محرک تھی۔ آپ کی تعلیمات کو جذب کرنے اور اس کو توسیع و ترقی دینے کے عمل میں عربوں کی عقلی زندگی میں باقاعدگی اور نظام پسندی کے صفات پیدا ہوئے نئے نئے علوم کی بنیاد رکھی گئی۔ احادیث، لسانیات، تاریخ اور فقہ کے نئے نئے علوم کی ترویج شروع ہوئی۔ ابتدائی عہد میں مدینہ کے علمی افلاس کو دیکھتے ہوئے یہ تبدیلی اور ترقی محیر العقول تھی۔ یہ بھی یاد رہے کہ علم و فکر کی اس توسیع میں نہ صرف عرب پیش پیش تھے بلکہ غیر عربی عناصر کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔ جدید علوم کی اختراع اور ترقی صرف اس مواد کی بناء پر عمل میں آئی جو تعلیمات نبوی میں پہلے سے موجود تھا۔ اس میں کسی خارجی اثر کا شائبہ نہیں ملتا۔

"اسلامی تہذیب کی صورت گری میں عربوں کا یہ حصہ نہ صرف بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ بلکہ درحقیقت فیصلہ کن ہے۔ اس تہذیب کے مادی عنصر میں عربوں کا حصہ بہت کم تھا۔ مادی حیثیت سے عربوں نے اس تہذیب کی ترقی میں صرف اس وقت حصہ لینا شروع کیا جبکہ امویوں کے بجائے عباسیوں کی حکومت کا آغاز ہوا۔ خارجی فتوحات کا پہلا دور ختم ہو چکا تھا۔ اب داخلی توسیع کا ایک عہد شروع ہو گیا ہے۔ نویں اور دسویں صدی میں اسلامی تہذیب انتہائے عروج تک پہنچ گئی۔ اس کی وسعت اور تخلیقی قوت میں بے انتہا اضافہ ہوا۔ ایران، عراق، شام اور مصر کے علاقوں میں تجارت، صنعت و حرفت، فن تعمیر اور دیگر فنون میں مزید ترقی ہوئی۔" ۷

اسی طرح علمی میدان میں بھی اسلامی تہذیب کی توانائی کا مختلف صورتوں میں اظہار ہو رہا تھا۔ ایک طرف مدینہ کے مذہبی علوم سمرقند سے لے کر شمالی افریقہ اور اندلس کے نئے مرکزوں میں پروان چڑھ رہے تھے، اور دوسری طرف مسلمانوں کا علم و ادب یونانی، ایرانی اور ہندوستانی اثرات کے تحت نئی اشکال اور نئی راہیں پیدا کر رہا تھا۔ بعض صورتوں میں یہ نئی ادبی اور فکری تخلیق مروجہ سانچوں کی تنگی سے گلو خلاصی حاصل کر کے آزادانہ نشو و نما کی طرف مائل تھی۔ مسلمانوں کے جغرافیائی اور علمی آفاق کی توسیع کے ساتھ ساتھ ان کی مادی اور روحانی زندگی میں شدید تفاعل کے آثار رونما تھے۔

مسلمانوں کے ابتدائی تاریخی اور لسانی علوم مذہبی دائرے سے نکل کر اب دنیوی علوم کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ یونانی اور سریانی تراجم کے وسیلے سے ریاضی اور طب کا یونانی سرمایہ اب مسلمان علماء کی دسترس میں آ گیا اور انہوں نے اس کو مزید ترقی کے درجے تک پہنچا دیا بالخصوص جبر و مقابلہ اور علم مرئیات میں مسلمانوں کا اضافہ نہایت گراں قدر تھا۔ سب سے زیادہ ترقی علم جغرافیہ میں ہوئی جس کے کئی ذیلی شعبے معرض وجود میں آئے۔ مثلاً سیاسی جغرافیہ، فلکی جغرافیہ، طبعی جغرافیہ اور اسفار۔ مسلمان جغرافیہ دانوں نے ایسے ایسے ممالک، اقوام اور تمدنوں کے حالات جمع کئے جن سے وقت کی مہذب دنیا بالکل نا آشنا تھی۔

ان علوم نے مذہبی عقائد اور روحانی افکار کو بہت کم متاثر کیا۔ لیکن یونانی فلسفہ اور منطق کی یلغار نے بعض بڑی تلخ مذہبی بحثیں پیدا کیں۔ مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں نے محسوس کیا کہ یونانی عقلیت نے ان کی روحانی بنیادوں کے لئے ایک بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔

اور اگرچہ انہیں فلسفیانہ افکار کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہوتی لیکن فلسفیانہ علوم کو وہ ہمیشہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے اس سے بھی زیادہ افسوسناک یہ امر تھا کہ مسلمان علماء کو ہر ایسی علمی کاوش اور تحقیق و جستجو سے نفرت ہو گئی جس کا مذہبی علوم سے کوئی راست تعلق نہ ہو یا جو ان کی نگرانی اور قابو سے باہر ہو۔

علمی ذوق کی اس تحدید اور تنگی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے علم ادب میں جاہلیت کی شاعری کو غیر ضروری اہمیت حاصل ہو گئی۔ مدینہ کے علوم میں عربی لسانیات میں سب سے زیادہ اہم حصہ جاہلیت کے شعر و ادب کا تھا۔ اب مسلمان ادیبوں نے جاہلیت کے ادب کو اپنی جولانگاہ قرار دے لیا۔ اور زمانۂ اسلام سے قبل کے عربی تمدن کا ایک ایسا مرقع آراستہ کیا جس کو حقیقت سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اس طرح چار صدیوں تک مسلمانوں کا سارا ادب عربی زبان تک محدود رہا اور اس میں عربی روایات اور خصوصیات کا پلہ اتنا بھاری تھا کہ ساری اسلامی تہذیب عربیت کے رنگ میں ڈوب گئی۔

مسلمان علماء کی یہ کوشش کئی صدیوں تک جاری رہی کہ ساری علمی اور عقلی زندگی کو مذہب کا تابع اور محکوم بنا دیا جائے جہاں کسی نئے محرک کے باعث مسلمانوں کے علمی ذوق کو ابھرنے کا موقع نہیں ملا وہاں مسلمانوں کی دینی ثقافت زندگی کی تمام فنی ادبی اور علمی سرگرمیوں پر حاوی رہی اور انہیں اپنے آلۂ کار کے طور پر استعمال کرتی رہی۔ ریاضی اور طب جیسے علوم جو دینی ثقافت کے بس میں نہ تھے۔ بہت جلد پژمردہ ہو گئے۔ لیکن کہیں کہیں مثلاً اندلس میں مسلمانوں کا تخلیقی جوش ان حدود و قیود کو توڑ کر اپنے لئے نئے راستے نکالنے میں کامیاب رہا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اسلامی تہذیب میں اخاذی کی صلاحیت موجود ہے۔

دینی ثقافت کو دیگر ثقافتی مظاہر پر حاوی کرنے کی کوشش کامیاب نہ ہوتی اگر خود اس ثقافت میں مسلمانوں کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کے لئے مناسب میدان مہیا کر سکنے کی گنجائش اور اہلیت نہ موجود ہوتی۔ دینی ثقافت نے جن علوم کو رد کر دیا تھا ان کی جگہ اب دینیات نے لے لی۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا علم علم فقہ تھا جو تمام انسانی اور الٰہی امور پر حاوی تھا۔ جس زبردست سرگرمی اور جامعیت کے ساتھ مسلمانوں نے اس علم کو ترقی دی اس کی مثال یہودی مذہب کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔

لیکن علمی اور تحقیقی پہلو سے قطع نظر اسلامی فقہ مسلمان قوموں کی اجتماعی زندگی اور تمدنی نظام کی تشکیل کا موثر ترین آلہ تھی اپنی جامعیت کے باعث فقہی نظام نے مسلمانوں کی شخصی اور تمدنی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا۔ اس نے بعض ایسے مشترکہ معیارات قائم کئے جن سے مسلمانوں کی زندگی میں یکسانیت پیدا ہو گئی اور ان کے اندر نسلی اور قومی امتیازات کی شدت کمزور ہو گئی۔ اگرچہ مقامی رسم و رواج اور قومی عادات و اطوار بالخصوص خانہ بدوش اقوام اور پہاڑی علاقوں کے باشندوں کی خصوصیات اسلامی فقہ کے عائد کردہ مشترکہ معیارات میں مزاحم ہوئیں۔ لیکن یہ مزاحمت بالآخر ناکام رہی اسلامی فقہ مسلمانوں کی وحدت پسندی کا مظہر تھا اور عملی ظہور تھی۔ اپنے بنیادی اصولوں میں وہ بالکل یکساں تھی۔ اگرچہ تفصیلات میں اختلافات موجود تھے۔ اسی فقہ کی بدولت دور وسطیٰ کے مسلمانوں میں طرز معاشرت اور اجتماعی مقاصد کا اتحاد پیدا ہوا۔ اس کے اثرات لادینی قانون سے کہیں زیادہ گہرے اور ہمہ گیر تھے کیونکہ اس کی بنیاد مذہبی تھی اور وہ مسلمانوں کے ضمیر و ایمان پر بھی اثر انداز تھی۔

جیسے جیسے مسلمان حکومتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے معیارات سے منحرف ہوتی گئیں اسلامی فقہ اور قانون کی معاشرتی اور تمدنی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ دسویں اور گیارہویں صدی میں خلافت عباسیہ کے زوال کے ساتھ مسلمانوں کا سیاسی انتشار شروع ہو گیا مقامی اور قومی حکمرانوں نے خلافت کے سیاسی اقتدار کو غصب کر کے سیاسی خود مختاری کی بنیاد ڈالی جس سے خانہ جنگیوں کا ایک دور شروع ہوا اور سیاسی استحکام رخصت ہو گیا۔ لیکن سلطنت کا مرکزی اقتدار خواہ کتنا ہی کمزور ہو گیا ہو اسلامی فقہ اور قانون کا اقتدار اسی نسبت سے اضافہ پذیر ہوتا گیا اور سیاسی آثار چڑھاؤ کے باوجود اس نے اسلامی دنیا کے معاشرتی اور تمدنی نظم کو شکست و ریخت سے محفوظ رکھا۔

دسویں صدی کے اختتام پر اسلام کے جغرافی حدود تقریباً وہی تھے جو ۷۵۰ء میں تھے۔ صرف چند ایک نئے علاقوں کا اضافہ ہوا تھا . . . . . لیکن اس عرصہ میں ایک عظیم الشان تہذیبی عمارت تیار ہو گئی تھی جو عقلی۔ معاشی اور تجارتی ثروت سے مالا مال تھی اور جس کے اجزاء و عناصر کو فقہی نظام نے ایک رشتہ اتحاد میں منسلک کر دیا تھا اور یہ تمام تہذیبی مظاہر مل جل کر اسلام کی دنیوی اور روحانی قوت و شوکت کا عملی ثبوت پیش کر رہے تھے۔ جب اس عظیم الشان تہذیب کی فوجی قوت کمزور پڑ گئی تو چھ سو سال قبل کی رومی تہذیب کی مانند سرحد کے وحشی قبائل اس پر چھا گئے۔ لیکن رومی تہذیب کی طرح اسلامی تہذیب نے بھی ان وحشی حملہ آوروں پر اپنے مذہب اپنی فقہ و قانون اور اپنی تہذیب کا سکہ قائم کرایا اور انہیں اپنے تہذیبی اقدار کے احترام پر مجبور کیا۔

یہ وحشی قوم وسط ایشیا کے ترکی قبائل پر مشتمل تھی جس طرح آبادی کے دباؤ کی وجہ سے بلغار۔ میگیار اور دیگر قوموں کو جنوبی روس اور مشرقی یورپ میں پناہ لینی پڑی۔ اسی طرح وسط ایشیا کے دوسرے قبائل ایران۔ عراق اور اناطولیہ میں داخل ہونے پر مجبور ہوئے۔ ان میں اسلامی تبلیغ کا آغاز اسی وقت ہو چکا تھا جبکہ ابھی یہ قبائل وسط ایشیا میں بود و باش رکھتے تھے۔ اسلئے مغربی ایشیا میں پہلے پہل ترکوں کی سلطنت قائم ہوئی تو اس سے ان علاقوں کے مسلمانوں کی زندگی میں بہت کم فرق آیا۔ ترکوں کی آمد کا پہلا نتیجہ فوجی توسیع کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جنوب مشرق میں ترک ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوئے اور شمال مغرب کی جانب وہ ایشیائے کوچک کے علاقہ میں پہنچ گئے۔ اسی زمانہ میں مغرب یعنی لیبیا کی طرف بربری قبائل حبشی افریقہ اور نائجیریا میں اسلام پھیلا رہے تھے۔ دوسری طرف خانہ بدوش عرب قبائل جو خلفاء کے مرکزی اقتدار کی گرفت سے آزاد ہو گئے تھے ان تہذیبی مرکزوں کو تاخت و تاراج کر رہے تھے جن میں خود ان کے آباؤ اجداد نے افریقہ کی تمدنی اور بازنطینی سلطنت کے ملبے پر سے آثار کو ختم کیا تھا۔

اسلامی دنیا میں خانہ بدوش عناصر کے داخلہ اور یورش سے عالم اسلام کو ایک ایسے مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا جس کی نوعیت لاطینی کلیسا اور جرمنی کے وحشی قبائل کی قائم کردہ حکومتوں کے باہمی تعلق سے ملتی جلتی تھی۔ اسلام کی نشوونما شہری تہذیب کے ماحول میں ہوئی تھی۔ ایک مضبوط مرکزی اقتدار اس کی اساسی معاملات کا جزو تھا۔ اور یہ روایت اسلامی مزاج میں اتنی پیوست ہو گئی تھی کہ جن عرب خانہ بدوش قبائل کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے انہوں نے اس روایت سے انحراف کر کے اپنے

آپ کو اسلام کی گرفت سے آزاد کر لیا ۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ایک قبیلوی نظم کو کس طرح اس دینی نظام اور ثقافت کا جزو بنایا جائے جو رعایتاً شہری زندگی کے نظم وضبط اور اقتدار کا خوگر تھا ۔ اس کا ایک حل تو وہ تھا جس پر اسلام نے اپنے ابتدائی عہد میں عمل کیا تھا یعنی طاقت کے استعمال سے خانہ بدوش عناصر کو شہری نظم وضبط کا عادی بنایا جائے لیکن یہ تدبیر صرف انہیں حکمران ترکی قبائل کی حد تک کارگر ہو سکتی تھی ۔ جو ترکی سلاطین کے درباری امرا کے ساتھ وابستہ تھے ۔ اور جو سے شہروں میں بس گئے تھے ۔ لیکن یہ طبقہ بالکل محدود اور قلیل تھا ۔ اگرچہ خود ترکی سلاطین پر جوش مسلمان تھے اور صدیوں تک ان کی حکومتوں نے شہری نظم کی پوری پوری پابندی کی لیکن اپنے خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش عوام پر مرکزی اقتدار کا رعب قائم رکھنا ان کے لئے بے حد دشوار تھا ۔

اسلام کو تمدنی اور سیاسی انتشار سے محفوظ رکھنے اور خانہ بدوش قبائل کو اسلام کی تہذیبی مرکزیت کے دائرہ میں لانے کا کام ایک ایسے طریقہ سے انجام پایا جسے گزشتہ دو صدیوں میں شہری آبادی کے درمیان آزمایا جا چکا تھا ۔ اس وقت تک اسلامی عقائد اور نظام زندگی کی اساس اتنی مستحکم ہو گئی تھی کہ وہ ان مزاحمتوں پر بآسانی غالب آ سکتے تھے ۔ جن کا ظہور گزشتہ صدیوں میں ملحدانہ اور فرقہ ورانہ تحریکات کی شکل میں ہوا تھا ۔ لیکن اسلامی نظام کے استحکام سے کوئی جمود نہیں پیدا ہوا ۔ اس کے برعکس شہری آبادی کے مذہبی جذبہ نے دائمی العقیدہ نظام فکر وعمل کے حدود کو توڑ کر تصوف اور اس کے طریق زندگی میں ایک نیا نظام پیدا کر لیا ۔ گیارہویں صدی سے صوفیوں نے مسلمانوں کے تمام اعلیٰ روحانی اور تخلیقی صلاحیتوں کو اپنے دائرہ میں جذب کر لیا ۔ اس طرح مسلمانوں کو روحانی تجدید کا ایک ایسا سرچشمہ ہاتھ آیا جس میں سے معاشی اور سیاسی زوال کے زمانہ میں بھی زندگی کے نئے دھارے بہتے رہے ۔

تصوف کا نشوونما ۔ جس انداز اور جن خطوط پر عمل میں آیا ان سے اسلامی تہذیب کے مزاج اور اس کی خصوصیات کا اظہار ہوتا ہے ۔ یہ تحریک نچلے طبقات میں پیدا ہوئی ۔ اس کی تخلیق اور نشوونما میں کوئی بیرونی عنصر شریک نہ تھا بلکہ یہ شہری آبادی کے ان طبقوں کی آزادانہ سرگرمیوں کے نتیجہ میں وجود پذیر ہوئی جو تجارت صنعت وحرفت اور دوسرے پیشوں سے تعلق رکھتے تھے ۔ اس پر انفرادی رنگ شروع سے غالب تھا ۔ اس تحریک کو نہ تو کبھی باقاعدہ سند قبولیت عطا کی گئی اور نہ اس کے علمبرداروں نے کبھی اس کی خواہش ظاہر کی ۔ اس کے برعکس ابتدائی دور میں صوفیوں کو علما کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ۔ لیکن یہ تحریک آخر تک آزاد و خود مختار رہی اور اس نے کوئی باقاعدہ جماعتی اور تنظیمی صورت نہیں پیدا کی بلکہ صوفی شیوخ اور رہنماؤں کی شخصی نگرانی اور قیادت میں کام کرتی رہی ۔ دو تین سو سال کے بعد اس کے اندر کسی قدر امارت جاتی رنگ پیدا ہوا ۔ اس کا اسلامی مزاج اس امر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شریعت کے جامد علمبرداروں کے مقابلہ میں اس نے فرد کے روحانی تجربات کا اثبات کیا اور شریعت کی ظاہری پیروی کرنے والوں کو اس نے روحانیت کا وہ درجہ عطا کرنے سے انکار کیا ۔ جو صرف ایک اعلیٰ اخلاقی کردار اور روحانی طرز فکر کا نتیجہ ہوا کرتا ہے ۔

صوفیوں نے اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ غیر مسلم خانہ بدوش قبائل میں اسلام کی روح پیدا کی اور غیر مسلم اقوام میں انفرادی طور پر اسلام کی تبلیغی جدوجہد کا آغاز کیا۔ ان کی سب سے زیادہ کامیاب تبلیغی سرگرمی مسلمان خانہ بدوش قبائل سے بہتر ہم غیر مسلموں کے درمیان عمل میں آئی جو بالکل جاہل اور وحشی تھے۔ انہیں صوفیوں نے وہ بنیاد فراہم کی جس پر بعد میں فقہ اور دینیات کے علمبرداروں نے ان قبائل کو اسلامی نظام کے تفصیلی تقاضوں سے آشنا کیا۔ انہیں کی کوششوں سے افریقہ، ہندوستان، جزائر شرق الہند، ترکستان اور چین تک اسلام کی سرحدیں پہنچ گئیں۔

صوفیوں کی تبلیغی سرگرمیاں شمال اور وسطی یورپ کی عیسائی خانقاہی تنظیم کی کارروائیوں سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔ لیکن ایک فرق یہ ہے کہ مسلمانوں کی تبلیغی جدوجہد زیادہ تر شخصی اور انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس میں تنظیم اور باقاعدگی کی ہمیشہ کمی رہی۔ علما اور فقہا کی سرگرمیوں کے ساتھ اس کا کوئی باقاعدہ اتحاد نہ تھا کیونکہ صوفی اپنی علیحدہ خود مختارانہ حیثیت پر شروع ہی سے مصر تھے بلکہ اکثر اوقات صوفیوں اور فقہاء کے مابین معاصرانہ نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ صوفی سرگرمیوں کی رہنمائی اور نگرانی کے لئے کوئی مرکزی ادارہ نہ تھا۔ یہ صحیح ہے ایک زمانہ میں خلافت کا مرکزی اقتدار نہایت قوی اور ہمہ گیر تھا۔ لیکن خلافت پاپائیت نہ تھی اور بنو امیہ کے زمانہ سے علماء اور فقہاء نے اس کو کوئی روحانی اور مذہبی اہمیت نہیں دی۔ خلفاء مسلمانوں کی دینی اور دنیوی زندگی کے سربراہ صرف اس معنی کر کے تھے کہ وہ دین اور شریعت کی حاکمیت اور بالادستی کی نمائندگی کرتے تھے۔ لیکن جب نویں صدی عیسوی میں بعض خلفاء نے دینیاتی عقائد کے بارے میں مداخلت شروع کی اور ایک سرکاری عقیدہ بنانا چاہا تو علماء اور فقہا کی سیادت کے مقابلہ میں انہیں کامل شکست ہوئی اور اس کے بعد پھر کسی مسلمان حکمران نے اس کوشش کا اعادہ نہیں کیا۔

خلافت کے زوال کے دوران میں جو خود مختار حکمران منصۂ شہود پر آئے انہوں نے خلافت کی روحانی بالادستی کو تو تسلیم کیا لیکن اپنے ملکی اور داخلی معاملات میں ان کی مداخلت یا اثر اندازی کی ہر کوشش کا سختی سے تدارک کیا۔ اسی وجہ سے انہوں نے علما اور فقہاء کے مقابلہ میں صوفیا کا زیادہ احترام و ادب ملحوظ رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا علما اور فقہا کی حیثیت ان خود مختار سلطنتوں میں مشتبہ اور غیر معین رہی۔

دسویں صدی سے مسلمان حکومتیں ان نظری اور اعتقادی خطوط سے روز بروز زیادہ انحراف کرنے لگیں جنہیں فقہا اور علماء نے اپنے خیالی نظام کے تحت معین کیا تھا۔ اس کے بجائے خود مختار مسلمان سلاطین نے اپنے طرز حکومت کے جواز میں ایک نیا نظریۂ اخلاق اور سیاسی نظریہ تشکیل دیا جو اسلامی اقدار سے بالکل جدا اور ایشیا کی شہنشاہی روایات سے ماخوذ تھا۔ اس خود ساختہ تہذیبی نظام کے خلاف علماء اور فقہا نے بڑا زبردست جہاد کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان حکمرانوں کو شریعت کی عاید کردہ دستوری اور قانونی پابندیوں سے آزاد ——— اور مسلمانوں کے جدید طرز حکومت کو اسلامی اصولوں سے منحرف نہ ہونے دیا جائے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کے سیاسی مفکروں نے زیادہ حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا اور تبدیل شدہ حالات

کی روایت سے سلطنت اور خلافت میں فرق کرنا شروع کر دیا۔ خلافت ان کی نظر میں وہ سیاسی نظام تھا جو شریعت کی بالادستی کو تسلیم کرے اور اس کے تابع زندگی کے تمام شعبوں کو برتنے کا روادار ہو۔ اس کے برعکس سلطنت کا مفہوم ان کے نزدیک یہ تھا یعنی خالص مطلق العنانی اور لادینیت ہے جس میں حکمران انسانی حقوق اور آزادیوں کی پرواہ کئے بغیر من مانے طریقوں سے حکومت کرتا ہے۔

اگرچہ اسلامی اقدار کو بحال کرنے کی جدوجہد نے مسلمانوں کی روحانی اور علمی زندگی کو مکمل زوال سے محفوظ رکھا لیکن اس جدوجہد میں فقہا اور علماء کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ اس میں کچھ ان کا اپنا قصور بھی شامل تھا کیونکہ انہوں نے سلاطین اور امراء کے تحت عہدے قبول کرنے کو خلاف تقویٰ خیال کیا۔ اس طرح نظم و نسق اور امور مملکت میں وہ عناصر دخیل ہو گئے جو بالکل موقع پرست تھے۔ اگرچہ علماء کی نیک نیتی میں شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکمران طبقے کی خرابیوں اور اخلاقی کمزوریوں کو روکنے والی کوئی طاقت نہیں رہی۔ متوسط طبقات نے بلاشبہ اسلامی اقدار و معیارات کو تسلیم کرنے میں کوئی تساہل نہیں کیا خواہ وہ ان پر کاربند ہوں یا نہ ہوں یا نہوں۔ جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا نہ صرف متوسط طبقوں میں بلکہ علماء اور فقہا میں بھی تصوف کے علمی اور اخلاقی افکار کا نفوذ بڑھتا گیا۔ اس طرح کسی قدر مبالغہ کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ کے اسلامی معاشرہ میں دو مختلف فکری اور تہذیبی رجحانات کارفرما اور متصادم تھے ایک تصوف کا اور ایک فقہ کا۔ اگرچہ بظاہر یہ دونوں اسلامی عقائد و افکار کے نام لیوا تھے لیکن درحقیقت ان کا طریقہ فکر اور انداز کار بالکل جدا تھا۔

تیرھویں اور چودھویں صدی کے دوران میں مغربی ایشیا پر جو طوفانی انقلابات آئے ان کی وجہ سے تصوف اور فقہ کے دو متضاد رجحانات کا باہمی ردعمل اور زیادہ تیز ہو گیا۔ سنہ ۱۲۲۰ء اور سنہ ۱۲۲۵ء کے درمیان شمال مشرق کے علاقوں پر منگول نسل کے حملہ آوروں کا پہلا سیلاب آیا اور اس نے زندگی کے پورے نظام کو درہم برہم کر دیا۔ دوسری مرتبہ ایران اور عراق کی باری آئی ۱۲۵۸ء میں خلافت عباسیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ مصر، عرب، اور شام کے سوا سارا عالم اسلام منگول سلطنت کا جزو بن گیا باقی حصوں کو مصر کے مملوک حکمرانوں نے منگول حملہ آوروں کی زد سے محفوظ رکھا۔ مصری مملوکوں کی حفاظت اور سرپرستی میں مسلمانوں کی قدیم عربی تہذیب دو ڈھائی سو سال تک قائم رہی۔ اس نے بعض فنون میں کسی قدر ترقی بھی کی لیکن بحیثیت مجموعی اس پر جمود طاری تھا۔ اسی زمانہ میں منگول حکمرانوں کے تحت ایران میں ایک نئی اور شاندار مسلم تہذیب نشوونما پا رہی تھی۔ اس نے فن تعمیر اور بعض دوسرے فنون لطیفہ میں بہت ترقی کی۔ روحانی حیثیت سے یہ تہذیب تصوف کے زیر اثر تھی۔ باوجود اس امر کے کہ اس زمانہ میں ایرانی علاقہ میں وہ طاعونی وباؤں اور تیمور لنگ کی ترکتازیوں کے باعث بڑی سخت ابتری اور بربادی پھیلی۔ اس جدید ایرانی تہذیب نے بہت سی مسلمان حکومتوں اور قوموں کی تہذیب کو متاثر کیا اور انہیں اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ چنانچہ اناطولیہ اور عثمانی ترکی ثقافت اور ہندوستان میں مغل ثقافت اسی ایرانی تہذیب کی مرہون منت تھی۔

ایشیا اور شمالی افریقہ میں عثمانی ترکوں کی فتوحات اور ہندوستان میں مغل حکومت کی توسیع کی بدولت عالم اسلام میں